R. No. 218657

Regd. No. [illegible]

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

Tele. No. 29
Telegrams
"ANJUMAN

ہماری زبان

جلد ۲۲ - شمارہ ۱۸	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۸ مئی سنہ ۱۹۶۳ء

عبدالمغنی

اَدَب میں علاقائیت

ایک زمانے میں دلی کو معیاری زبان کا واحد مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ بھی اس دعوے میں شریک ہو گیا نتیجۃً دونوں کے درمیان ایک عرصے تک رقابت اور چشمک ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک تیسری بساط عظیم آباد میں بچھ گئی۔ پھر حیدرآباد اور لاہور نے بھی اپنے اپنے مکاتب کھول لئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ مرکز پر مرکز قایم ہوتے چلے گئے۔ غیر منقسم ہندوستان کا شاید ہی کوئی متمدن علاقہ یا بڑا شہر ہو جہاں اُردو کا ایک نہ ایک مرکز کسی نہ کسی سطح پر قایم نہ ہو گیا ہو۔ چنانچہ مرکز کے نام پر فی الواقع اُردو کے بہت سے بڑے چھوٹے علاقے پیدا ہو گئے۔

آزادی سے قبل تک تو بات اتنی ہی رہی۔ اس کے بعد جب تقسیم عمل میں آئی اور سرحد کے دونوں جانب آزاد ثقافتی سرگرمیاں شروع ہوئیں اساتھ ہی سیاسی داؤ پیچ شروع ہو گئے تو زبان اور ادب کا مسئلہ بھی' دوسرے سارے مسائل کی طرح' چند در چند تعصبات میں اُلجھنے لگا۔ مشترک دشمن کے چلے جانے کے بعد قومی جوش نے اپنے اظہار کے لئے بہت ساری عصبیتیں نکال لیں۔ ان عصبیتوں میں سب سے قوی' لسانی نقطۂ نظر سے' علاقائیت ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگوں کو شدت سے محسوس ہونے لگا کہ ملکی تہذیب کے اندر وہ ایک مستقل اور دوسروں سے مختلف ثقافتی دائرہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بڑی تن دہی سے اپنے قدیم ورثے کی تفتیش شروع کی۔ ناچ کے مقامی انداز' سنگیت کی مقامی لے' نقاشی کی مقامی تراش' بول چال کے مقامی محاورے وغیرہ ڈھونڈ نکالے۔ اپنی ان دریافتوں کے بل پر انھوں نے اپنے علاقائی مزاج کی جداگانہ خصوصیت کا دعویٰ کیا۔ ہر معاملے میں مقامی رنگ کے تحفظ کا مطالبہ ہونے لگا۔

مقامیت کی اس علاقائی تحریک سے اُردو زبان کو بھی سابقہ پڑا ہے۔ لوک سنگیت، لوک ناچ، لوک بھاشا اور اسی طرح کے دوسرے ثقافتی مظاہر سے اثر قبول کرنے کا مشورہ اسے بھی دیا جا رہا ہے۔ یہ آواز اب سرگوشی سے بڑھ کر نعرہ بنتی جا رہی ہے کہ زبان کو اگر زندہ رہنا اور آگے بڑھنا ہے تو مختلف علاقوں میں اسے پنجابی، سندھی، بنگالی، پشتو، بھوج پوری، میتھلی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ بولیوں اور دوسرے ثقافتی وسایل سے بہتیری ادائیں مستعار لینی ہی ہوں گی۔ اس لئے کہ زبان میں تازگی اور عمدگی اسی طرح آئے گی۔ اسی طریقے سے زبان کی تاریخی روایت کا ارتقا فطری تسلسل کے ساتھ ہوگا۔ ورنہ خدشہ ہے کہ یا تو زبان سوکھ کر فنا ہو جائے گی' یا پھر زبان میں ایسا انقلاب برپا ہو جائے گا کہ ماضی و حال ایک دوسرے سے کٹ کر اجنبی ہو جائیں گے۔ بلکہ جہاں تک اجنبیت کا تعلق ہے' یہ تو علاقائیت کے زیر سایہ ارتقا کی صورت میں بھی ہو کر رہے گی۔ کیونکہ مستقبل ہمیں تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ اُردو زبان اب وسعت کے اس نقطے پر آ پہنچی ہے کہ ایک دوسرے سے بعید مختلف خطوں میں اس کا روپ ہر ہر جگہ یکسر بدل جائے گا۔

یہ واقعہ نہیں بلکہ خطرہ ہے۔ اور یہ خطرہ خود علاقائیت کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی (اقبال)

اس سے نہ مقام کی نفی مقصود ہے اور نہ وطن کی تردید۔ ہر آدم خاکی آب و گل کے ایک محدود جغرافیے میں پرورش پاتا ہے۔ اس کے جسم کا خمیر بھی مقامی مٹی سے اٹھتا ہے اور اس کا ذہن گرد و پیش کی آب و ہوا میں ہی بنتا ہے۔ چنانچہ اس کی شخصیت کا ہر اظہار ماحول کا رنگ لئے ہوگا۔ ایک ادیب کا اسلوب بھی اس کے

علاقۂ تربیت کے نقوش کا یقیناً حامل ہوگا، بشرطیکہ یہ علاقہ واقعی کوئی مستقل تہذیبی روایت رکھتا ہو۔ یہ ایک عمومی اثر ہے جو قدرتی فضا کا افراد کی حرکتوں پر۔

لیکن یہ تو کائنات کا ایک خاموش عمل ہے جو نامعلوم صدیوں سے خود بخود ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ اسی طرح فطری ہے جیسے اعضا کا تناسب اور چہرے کا رنگ اور لہجے کا خم۔ بغیر کسی کے کہے سُنے یہاں تک کہ خود جانے بوجھے، مختلف علاقوں کے افراد ادب (اور دوسرے فنون) میں اپنی اپنی خصوصیتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں، اور ان میں بعض زور آور شخصیتوں نے اپنی انفرادی خاصیتوں کا مستقل اضافہ بھی کیا ہے۔ گلہائے رنگ رنگ کے یہ مختلف اضافے ہی ہیں جن کے تسلسل سے ہمیشہ چمنِ ادب کی زینت برقرار رہی۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ پرانے مرکزوں میں ادب خستہ و فرسودہ ہو کر زائل ہونے لگا ہے تو ایک دور افتادہ خطے سے نئی آواز اُبھری ہے اور اس کی تازہ قوت نے پورے ادب کی تجدید کر دی ہے، پوری ادبی روایت کو نیا رُخ اور نئی حرکت، تازہ ولولے اور تازہ عزائم عطا کر دئے ہیں۔ اردو ادب کی تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد اور عظیم آباد۔ شعر و سخن کے تمام آتش کدے سرد ہوئے جا رہے تھے تو لاہور سے ایک نیا شعلہ اُٹھا اور اس نے آنے والی کئی صدیوں کے لئے گرمی و روشنی کا سامان کر دیا۔

مرکز کو علاقے سے یہ تقویت ظاہر ہے کہ علاقائیت سے نہیں پہنچ سکتی۔ لوک سنگرتی اور لوک کلا کے نام پر علاقائی تحریکیں برپا کرنا ایک سادہ سی بات کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنانا ہے۔ یہ ایک فطری عمل کو مسخ کر کے سراسر مصنوعی بنا دینا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سانس دہانے کی بجائے نلکی سے لینے کی کوشش کی جائے۔ دراصل یہ معاملہ سرے سے علاقائیت بمقابلہ مرکزیت کا ہے ہی نہیں۔ عمرانی نقطۂ نظر سے یہ انفرادیت اور اجتماعیت کے تعاون کا مسئلہ ہے اور ادبی اعتبار سے اس کو روایت اور انفرادیت کے توازن کی بات کہیں گے۔ بہر حال، یہ ایک بالکل شخصی معاملہ ہے، کوئی سماجی مسئلہ نہیں۔ یہ رنگ و بوئے گل کی طرح خود رو بکار ہوگا۔ اس کو حل کرنے کے لئے کسی تنظیم کی حاجت نہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں کہنا چاہیے کہ اس کا تعلق لاشعور سے ہے نہ کہ شعور سے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کو ایک شخص ورثے میں پاتا ہے۔ چنانچہ اگر جزو کو اپنی جداگانہ نوعیت کا زعم ہو گیا تو اس کے اندر کُل کے ساتھ تعاون کی بجائے علٰحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہو جائے گا۔ دوسری طرف کُل بھی ایسے شوریدہ سر جزو کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ نتیجہ دونوں کے درمیان کچھ ویسی کشمکش برپا ہو جائے گی جیسی زمین اور چاند کے درمیان سائنس داں بتاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی کشمکش کا انجام بھی تفریق کے سوا کچھ نہیں۔

کسی ملک اور قوم کی تہذیب کے مظہر فنون لطیفہ ایک کُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کُل کے تحت قبیلوں اور علاقوں کے بہتیرے اجزا ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کُل اپنے اجزا سے ہی مرکب ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف اجزا بھی کُل سے الگ اپنا کوئی تشخص نہیں رکھتے۔ کُل اور اجزا کی باہمی نسبت ایک جسمِ واحد کے اعضا کی ہے۔ ہر عضو کی حرکت علٰحدہ ہونے کے باوجود دوسرے اعضا کی جنبش سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ کوئی ایک عضو ہلتا ہے تو اسی لمحے اہتزاز کی رَو پورے نظامِ جسمانی میں دوڑ جاتی ہے۔ پوری شخصیت منظم طریقے پر مربوط ہوتی ہے اور متعدد حصے الگ الگ کام کرنے کی بجائے ایک وقت میں ایک ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسی مرتب ارتباط کا تقاضا ہے کہ علاقے مقامی تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اپنے عام جوہر کو مرکزی نظام میں بغیر کسی تکلف کے نافذ کر دیں۔ یہ عمومی توسیع اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب نظر ایک مرکزی کُل پر مرکوز رہے، نہ کہ علاقائی اجزا میں آوارہ ہو۔ ہر ادیب، خواہ کسی خطے کا ہو، اپنا واحد شعوری مقصود کُلی نظام کی خدمت کو بنائے اور تمام جزوی عناصر کو بھول کر اسی میں جذب ہو جائے تب ہی ممکن ہوگا کہ وہ اپنی علاقائی خصوصیت کو بھی منوا سکے، جس کے لئے تحریک، نعرہ اور کوشش کی کوئی ضرورت نہیں۔ ورنہ ع موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں۔

معاملے کی تہ میں نکتہ یہ ہے کہ ہر نئے ادیب کے سامنے ماضی کی مستحکم روایت پھیلی ہوئی ہوتی ہے، خواہ مخواہ اس کو اپنے حال کی لکیر اسی روایت کے نقشے میں بنانی ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعی اپنے ادب کو کوئی نئی چیز دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کی انفرادیت روایت کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان ابتدائی آویزش بھی متصور ہے لیکن اگر روایت کو تازہ ہونا اور انفرادیت کو روایت بننا مقدر ہے تو قدیم اور جدید کے درمیان مفاہمت اور آخر کار ہم آہنگی لازمی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ منفرد ادیب اپنے مزاج کی خاصیتوں کو خود ادب میں تحلیل کر دیتا ہے۔ اور یہ خاصیتیں بڑے ماحول اور اپج کے بے شمار ناقابلِ تقسیم اجزا سے مرکب ہوتی ہیں۔ ادیب کی زندگی چند در چند عناصر کا ظہور ترتیب کا اور جب وہ ادب میں فنا ہو جاتا ہے تو یہی اجزا پریشاں ہو کر جزوِ ادب بن جاتے ہیں۔ اقبالؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جس زمانے میں انھوں نے اپنا کام شروع کیا دلّی اور اس سے زیادہ لکھنؤ کی نزاکت شاعری پر طاری تھی۔ وہ داغؔ دہلوی کی تجدید پنجاب کرنے والے تھے۔ اس خطے کے دلچسپ اساطیر و اسالیب دامنگیر بھی تھے۔ مگر ان کے ہر گیر ذہن نے ایک محدود دائرے میں اسیر ہو کر شاہ عبداللطیف بھٹائی ہو کر رہ جانا گوارا نہیں کیا۔ انھوں نے اردو شاعری کی وسیع علامات ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا، بلکہ یہی جانب ہے جو کچھ اضافہ بھی کیا تو اردو کے اصل سرچشموں ہی سے، اِدھر اُدھر کے ندی نالوں سے نہیں۔ ان کے اسلوب پر بھی علاقائی محاورے کی کوئی چھاپ نہ پڑی۔ لیکن اس سب کے باوجود ان کا تیور پنجابی ہے۔ اقبالؔ کے کلام سے اردو ادب بالخصوص شاعری کو جو صلابت، شوکت، شوخی اور تندی ملی اس کو اگر چھانا جائے تو سرزمینِ پنجاب کی مٹی کے ریزے ضرور ملیں گے۔ یہ ہے علاقائی مزاج کے رنگ کی فطری، سلیقہ مند اور نتیجہ خیز گُل کاری!

ادب کے یہ وہ حقائق ہیں جن سے انکار معقول نہیں۔ لیکن اِدھر کچھ عرصے سے مختلف خطوں میں اردو پر یہ دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ مقامی بولیوں، ان کے لسانی محاوروں اور لہجوں، اور تہذیبی اشاروں کو اپنے اندر جذب کرلے۔ جہاں تک اخذ و جذب کے اصول کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ مسلّم ہے،

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ہماری زبان

۸ رمئی ۱۹۶۳ء

کیا نستعلیق ٹائپ ضروری ہے؟

یونیسکو انفارمیشن بلیٹن کے اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارے میں جناب زبیر رضوانی کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں انھوں نے نستعلیق ٹائپ کی ضرورت پر زور دیا ہے اور یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے بڑی حد تک اُن دشواریوں پر قابو پالیا ہے جو اس کے تجارتی معیار پر لانے کی راہ میں حایل ہیں۔ ہر اُردو دوست کو اُن کے ٹائپ کے مکمل ہونے کا انتظار رہے گا لیکن افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ نستعلیق ٹائپ کیوں حیدرآباد میں برسوں کی کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر انھوں نے سجاد مرزا صاحب کے بنیادی رسم الخط پر مضمون کا مطالعہ کیا ہوتا تو انھیں اندازہ ہو جاتا کہ نستعلیق ٹائپ بڑے حرفوں کا اور تھوڑے سے کام کے لئے تیار ہو سکتا ہے، مگر عام اخباری اور کتابی تحریر کے لئے، خصوصاً حواشی اور اقتباسات کے لئے اتنے جوڑوں اور اتنی مخصوص شکلوں کا قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ روس کے ایک ادارے نے اس سلسلے میں کچھ تجربے کئے ہیں۔ خاصی خط و کتابت کے بعد یہ اطلاع ملی کہ انھوں نے نستعلیق ٹائپ کا خیال چھوڑ دیا ہے ہاں نسخ کو اور خوبصورت بنایا ہے اس لئے ہماری رائے میں افادیت اور ضرورت کو مقدم سمجھنا چاہیے اور نسخ ٹائپ کو عام ضروریات کے لئے اختیار کر لینا چاہیے۔ نستعلیق کو ایک فن لطیف کی حیثیت سے باقی رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں سرخیاں اور خاص خاص کتابیں شایع کرنی چاہئیں۔ عام کتابیں، اخبار اور رسالے نسخ ٹائپ میں ہی چھاپنے چاہئیں۔

شوکت تھانوی بھی چل بسے

ریڈیو پر یہ خبر سُن کر بڑا صدمہ ہوا کہ اُردو کے مشہور مزاح نگار اور صحافی شوکت تھانوی ساٹھ سال کی عمر میں عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ شوکت بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ریڈیو کا یہ احسان ہے کہ اس نے شوکت کی ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے بہت لکھا اور گو اُنکی تصانیف میں پست و بلند بھی کچھ ہے، مگر سودیشی ریل کے خالق، شیش محل کے مصنف اور کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان کے ادیب کو اُردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

سیر بین

یونی ورسٹی میں عید کے موقع پر جو چہل پہل ہوتی ہے وہ بقرعید کے موقع پر نہیں ہوتی۔ عید کے موقع پر مجمع اتنا ہوتا ہے کہ یونی ورسٹی کی مسجد سے باہر سڑک پر اور گھاس پر صفیں آراستہ ہوتی ہیں، بقرعید کے موقع پر زیادہ تر لوگ مسجد کے اندر ہی سما جاتے ہیں، بقول ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم دو چار "متنفس" ہی باہر ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں بیشتر طلبہ اپنے گھروں کو سدھار چکے ہوتے ہیں اور گرمی کی تعطیل شروع ہوتے ہی بلکہ اُستاد بھی رُخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر اسٹاف کلب کا ایٹ ہوم صرف عید کے موقع پر ہوتا ہے۔ بقرعید کے موقع پر ملنے ملانے کا سلسلہ بھی دیر میں شروع ہوتا ہے، پہلے قربانی سے فراغت کی فکر ہوتی ہے۔

قربانی پر مجاز مرحوم کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک زمانے میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر عیاذ انصاری پروگرام انچارج تھے۔ دستور کے مطابق بقرعید کے موقع پر ایک عالم کی تقریر اور عید پر ایک نظم یا ایک مزاحیہ فیچر کا پروگرام تھا۔ عیاذ انصاری تقریر کو تو نہ کاٹ سکے، مگر مزاحیہ فیچر یا نظم کے بجائے اُنھوں نے ایک مختصر بزم مشاعرہ کا اعلان کیا۔ مجاز نے برسوں سے کوئی شعر نہیں کہا تھا۔ طے ہوا کہ مجاز اور راقم السطور تازہ افکار پیش کریں گے۔ عید کے دن بھی ہم لوگوں کا ایک پھیرا کافی ہاؤس کا ہو جاتا تھا۔ وہاں مجاز مرحوم سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "کہو بھائی! آج شام کو تمہاری قربانی ہے" مجاز تلملا گئے۔ بولے "سرور صاحب قربانی نہ کہیئے، جھٹکا کہیئے"۔

ایک زمانے میں اسٹیٹسمین کا نامہ نگار دہلی میں عید قرباں کی رپورٹ کے ساتھ یہ بھی لکھا کرتا تھا کہ اب کے بکروں کی قیمت یہاں تک پہنچی اور دُنبوں کے دام اتنے لگے، اب کے وہ صرف یہ کہہ کر گزر گیا کہ قربانی کے جانور بہت گراں تھے۔ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے۔ ع

بکرے جو کاٹتے تھے وہ مینڈھے پہ آ گئے

مگر نصرت لاہور کا ایک مضمون نگار تو مرغی کی قربانی کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ قربانی دینے کا فلسفہ پرانا ہو گیا۔ اب اپنے گوشت کے لوتھڑے (Pound of Flesh) پر اصرار کا زمانہ ہے۔

انجمن ترقی اُردو پنجاب

اوم پرکاش ملک جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ پنجاب نے ۲۶ر اپریل کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی اور پنجاب کے پیچیدہ لسانی مسئلے کو پیش کیا اور اس کو حل کئے جانے کی متعدد تجاویز بھی پیش کیں جنھیں نائب صدر جمہوریہ نے غور اور دلچسپی کے ساتھ سُنا اور ہر قسم کی جائز امداد دینے کی رضامندی ظاہر فرمائی۔

ملک صاحب نے کہا کہ ہمارا پیارا وطن ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اس سے پیشتر تقریباً ایک صدی تک پنجاب کی سرکاری زبان صرف اُردو ہی تھی لیکن وہاں آج والدین کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے بچوں کے لئے ذریعۂ تعلیم طے کرسکیں۔

ملک صاحب نے کہا کہ کچھ عرصہ بعد پنجاب میں پنجابی صوبہ کے حصول کی تحریک شروع کی گئی جس کے نتیجہ کے طور پر سچر فارمولا پنجاب میں لاگو ہوا۔ اس کے بعد پھر دوبارہ پنجابی صوبہ کی تحریک نے سر اٹھایا تو سرکار کو مجبوراً زبان کے لحاظ سے دو حصّوں یعنی ہندی اور پنجابی ریجن میں پنجاب کو تقسیم کردینا پڑا۔ جس کی رو سے ان دونوں ریجنوں کی سرکاری زبان بالترتیب ہندی اور پنجابی (حروف گورمکھی) کردی گئی۔ اور اسکولوں میں بچوں کے لئے پرائمری درجہ تک صرف اپنے ریجن کی زبان پڑھنا لازمی ہو گیا۔ اس فارمولہ کا یہ اثر ہوا ہے کہ پنجاب کے رہنے والے اپنے آپ کو لسانی اعتبار سے دو مختلف صوبوں کا رہنے والا تصور کرنے لگے ہیں۔

انھوں نے نائب صدر جمہوریہ کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرائی کہ پچھلے سال ۲ر اکتوبر کو پنجاب سرکار نے یہ فیصلہ کیا کہ اس تاریخ کے بعد پنجاب کی عدالتوں اور دفاتر میں اُردو زبان میں کوئی بھی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ تنگ نظری ایک دوسرے کی زبان کے ساتھ نفرت کے جذبے کی پیداوار ہیں جس سے آج پنجاب میں صحیح دماغ رکھنے والے لوگ سخت پریشان ہیں۔

اس سرکاری رویے کے باوجود آج بھی پنجاب میں عوامی سطح پر اُردو زبان کے چلن کا یہ عالم ہے کہ پنجاب میں تمام زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات کی مجموعی تعداد اُردو زبان کی تعداد سے بہت ہی کم ہے۔ پنجاب میں ہندی اور پنجابی زبان کے بہی خواہ اپنی زبان کی تحریک کو بدستور چلانے کے لئے اُردو زبان ہی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ پنجاب کے لوگ اپنا حساب کتاب، خط و کتابت، تحریر و تقریر زیادہ تر اُردو زبان ہی میں کرتے ہیں۔ لیکن سرکار نے ان فارمولوں کو بنا کر پنجاب کے پڑھے لکھے عوام کو ان پڑھ بنا کر رکھ دیا ہے۔ (جنرل سکریٹری)

راجستھان کے اُردو دوستوں سے

ڈائرکٹر صاحب پرائمری اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان نے ایک نہایت ضروری اور تاکیدی حکم اپنے ماتحت دفاتر کے نام جاری کیا ہے۔ حکم میں کہا گیا ہے کہ ہر پرائمری اسکول میں جو سرکاری ہو یا ایڈیڈ اور اس میں اقلیاتی لسانی طبقہ کے طلبہ ہوں یا نہ ہوں ایک رجسٹر رکھا جائے جس میں مادری زبان کے طلبہ کی تعداد درج کی جائے گی۔ لہذا جن بچوں کی مادری زبان اُردو ہے ان کے سرپرست اپنے اپنے یہاں کے پرائمری اسکولوں میں اپنے بچوں کے داخلہ سے پہلے ہی ان کے نام درج کرادیں اور داخلہ کے وقت بھی۔ ہر دو موقع پر اپنی اور اپنے بچے کی مادری زبان اُردو کا صحیح اندراج دیکھ لیں۔ داخلہ سے پہلے رجسٹر میں اندراج کرا دینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں کی تعداد پوری ہوتے ہی وہاں اگر اُردو کے اُستاد کا انتظام نہیں ہے تو کر دیا جائے گا اور کورس کی کتابوں کا بھی۔ ایک پرائمری کلاس میں دس یا پورے اسکول میں چالیس لڑکے، لڑکوں کی مادری زبان اگر اُردو ہوگی تو اس اسکول میں اُردو پانچویں درجہ تک پڑھائی جائے گی اور جملہ مضامین اُردو میں پڑھائے جائیں گے اور تیسرے سے ہندی بھی تاکہ بچہ ہندی میں کمزور نہ رہے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اُردو شاخ راجستھان نے اپنی شاخوں کے علاوہ اپنے ممبروں سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ اپنے شہر، قصبہ یا موضع میں اندراج رجسٹر کی مہم اپنے ذمہ لیں اور اپنے علاقے یا محلے کے اسکول میں صحت کے ساتھ رجسٹر کا اندراج کرائیں۔

مہاراشٹر اُردو پبلیشرز اور اُردو کمیٹی

اُردو زبان و ادب کے تحفظ و ترقی کے لئے ہندوستان کے مختلف ادارے اپنے اپنے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بھی اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کے لئے "ادبی انعامات" دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس قسم کی ہمت افزائی کو ساری اُردو دنیا نے سراہا ہے۔ مہاراشٹر اُردو پبلیشرز اور اُردو کمیٹی اس ریاست کے اُردو تاجران کتب کی ایک انجمن ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ریاست مہاراشٹر میں (جہاں اُردو جاننے والے سب سے بڑی اقلیت ہیں) بسنے والے لوگوں کے کلچر اور ان کی زبان کو قریب تر لایا جائے اور باہمی ثقافتی رشتے کو مضبوط کیا جائے۔ اس کمیٹی نے ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے۔ یہ کمیٹی مہاراشٹر کے ادیبوں کی سال بھر میں شائع ہونے والی اُردو کتابوں میں سے انتخاب کرکے ادبی انعامات دیتی ہے، ساتھ ہی ساتھ ریاست کی سرکاری زبان مراٹھی میں شائع ہونے والی کسی ایسی کتاب کو بھی جو اُردو ادب سے متعلق ہو، ایک انعام دیتی ہے۔

اس سال کمیٹی اپنے دوسرے سالانہ جلسے کے انعقاد کی تیاریاں کر رہی ہے۔ کمیٹی اس سال حسب ذیل کتابوں پر انعامات دے گی۔ (۱) میرزا مظہر جان جاناں (عبدالرزاق قریشی) (۲) اُردو غزل ولی تک (ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی) (۳) یادیں (اختر الایمان) (۴) دیوان میر (مرتبہ سردار جعفری) (۵) اُردو کا دیدا چاپرچے (مراٹھی میں اُردو شاعری کا تعارف۔ از سینو مادھورا؟)

(رشاد علی خان
جنرل سکریٹری)

منشاء الرحمن منشاؔ

آثارِ حیات

صورتِ برقِ تپاں شعلہ فگن اُٹھے ہیں
عزم نو لے کے جوانانِ وطن اُٹھے ہیں

حفظ ناموسِ محبت کے لئے دیوانے
اپنے من میں لئے مرنے کی لگن اُٹھے ہیں

رُخ زمانہ کی ہواؤں کا بدلنے والے
آج ڈالے ہوئے ماتھے پہ شکن اُٹھے ہیں

سرد مہری رفیقاں کی عنایت ہے کہ ہم
سوز غیرت سے جلائے ہوئے من اُٹھے ہیں

پیکرِ مہر و وفا ہم ہیں مگر مجبوراً
ہاتھ میں تیغ لئے غلغلہ زن اُٹھے ہیں

آنچ تو قیرِ وطن پہ نہیں آنے دیں گے
اب تو باندھے ہوئے ہم سر سے کفن اُٹھے ہیں

سر انھیں اپنا بہر حال جھکانا ہوگا
سرکشی کو جو بصد حیلہ و فن اٹھے ہیں

اب اندھیروں سے کہو خیر منائیں اپنی
ذرّے دھرتی کے مری بن کے کرن اٹھے ہیں

چند لمحات کے مہمان نظر آتے ہیں
وہ بگولے جو سرِ صحنِ چمن اٹھے ہیں

مادرِ ہند کی عظمت کو بچانے کے لئے
ہم بھی کھا کر قسم عظمتِ فن اُٹھے ہیں

جب بھی آیا ہے کڑا وقت وطن پر منشاؔ،
لے کے ہم حوصلۂ فتنہ شکن اٹھے ہیں

رحمٰن جامی

ہم شاعر متوالے ہیں

کتنے غم اپنے سینوں میں ہم نے اب تک پالے ہیں
حسن کی باتیں عشق کے قصے سب ہم نے کہہ ڈالے ہیں
گیت ہمارے پھول کھلائے ہر محفل میں رنگ جمائے
اپنے شعروں کی اگنی سے بجھتے دل کی جوت جگائے
سارے چہرے اس دنیا کے اپنے دیکھے بھالے ہیں
ہم شاعر متوالے ہیں۔

ہم نے اپنے قلم سے اب تک پیار کا اک پیغام دیا تھا
ہم نے اپنی تحریروں سے حسن کو اذنِ عام دیا تھا
لیکن اب ہم اپنے قلم سے "جیت" کے نغمے لکھیں گے
اور دشمن کی ہار، پہ اپنی "ریت" کے نغمے لکھیں گے
اپنا قلم ہے اور دشمن کی اب تو جان کے لالے ہیں
ہم شاعر متوالے ہیں۔

شہاب سرمدی

جانتا اور ریل گاڑی

رات کے پچھلے پہر،
کل پاس والے گاؤں میں
اک گرہستن، دُھن کی پوری
اپنا جانتا پیستی تھی
میں یہ سمجھا،
شہر سے چھٹ کر کہیں کو ریل گاڑی جا رہی ہے۔

"گھر، گھر، گھر" کی گھر آواز جتنی دُور تھی اتنی رہی
بلکہ جوں جوں رات بھیگی،
اور بھی کچھ ہو گئی۔

گھر گرہستن، سارا گھر جاندن سکئے:
اک کوٹھڑی میں،
جانت کی مٹھیا دھرے،
پاؤں کی گت پر جھومتی،
محلوں کے سپنے دیکھتی،
کچھ گا رہی تھی۔

میں نے چاہا،
گیت کے دو بول لکھ لوں
ناگہاں، اک ریل گاڑی
دندناتی،
صبح کی ٹھنڈی ہوا کو چیرتی
تیزی سے گزری۔
سیٹیوں پہ سیٹیاں دیتی ہوئی
اور جیسے اس کے پیچھے
رس بھرے دو بول گیت کے
گیت ہی سارا اکیل کر رہ گیا۔

غزلیں

حسرت سہروردی

ایک مدت ہوئی تھی بات ہوئے یہ بھی کوئی تعلقات ہوئے
ان کے آنے سے ان کے جانے تک کیا خبر کتنے حادثات ہوئے
اہلِ کعبہ کی خیر ہو یا رب شیخ جی وقفِ سومنات ہوئے

زہیر کنجاہی

در خورِ گوش نہ ہو جبکہ کہانی میری داستاں میری سُنے کون زبانی میری
اے صبا جلوہ گہہ ناز میں گر تو پہنچے میرے محبوب کو روداد سنانی میری
انھیں اشعار میں الفت کو سمویا میں نے انہیں اشعار میں پنہاں ہے کہانی میری

سید فضل المتین

اجمیر کا پہلا اُردو شاعر شیخ دانیالؒ

بعض افراد کا کہنا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کی زبان فیض ترجمان سے بھی ایسے فقرے جاری ہوئے ہیں، جنھیں ہم زبان اردو کی ابتدائی حیثیت کا نام دے سکتے ہیں۔ اگر واقعی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ نے کچھ فقرے اردو الفاظ میں فرمائے ہیں تو پھر اس کا بھی یقین کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے چند اشعار اردو بھی فرمائے ہوں گے۔ مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک خواجہ بزرگؒ کے مفصل (مستند و صحیح حالات) دستیاب نہیں ہو سکے ہیں، اور ان کے نام سے جو فارسی دیوان منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی علمی و تحقیقی حلقوں میں مشتبہ قرار دیا جا چکا ہے[1]۔ تاہم بعض فارسی اشعار ایسے ہیں جن کے لئے ہمارے پاس ایسے کوئی دلائل نہیں کہ وہ آپ کے ہیں یا نہیں؟ بہر صورت یہ بات علمی و تحقیقی حلقوں کے لئے غور طلب ضرور ہے کہ کیا واقعی کوئی (اردو) فقرہ یا کوئی (اردو) شعر ایسا ہے جسے خواجہ بزرگؒ کا کہا جا سکے۔

آج علم و تحقیق کی روشنی میں ہم جسے اجمیر کا پہلا اُردو شاعر کہہ سکتے ہیں وہ شیخ دانیالؒ ہیں جن کے متعلق خواجہ معنی اجمیری تحریر فرماتے ہیں[2]:

"عہد اکبری میں شیخ دانیال خدام خواجہ کی جماعت میں ایک ممتاز بزرگ تھے۔ سنہ ۹۷۹ھ میں جب اکبر بادشاہ اجمیر آئے اور یہاں سے واپس ہونے لگے تو ایک بیگم کو شیخ دانیال کے گھر میں چھوڑ گئے۔ اس لئے کہ زچگی کا زمانہ قریب تھا۔ ۲ جمادی الاولیٰ کو شاہزادہ پیدا ہوا۔ تو جس طرح حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے نام پر جہانگیر کا نام شاہزادہ سلیم رکھا تھا۔ اسی طرح شیخ دانیال کے نام پر اس مولود کا نام شاہزادہ دانیال رکھا۔

خود بادشاہ جہانگیر نے اس واقعہ کو تزک جہانگیری میں اس طرح لکھا ہے:

تولد او در اجمیر در خانۂ یکے از مجاوران آستانۂ متبرک خواجہ بزرگوار خواجہ معین الدین چشتی کہ شیخ دانیال نام او ست وقوع یافت بہمان مناسبت بدانیال گشت۔ ۱۲

(تزک جہانگیری ص ۱۹)

یعنی شاہزادہ دانیال درگاہ شریف کے مجاوروں میں سے ایک مجاور کے گھر پیدا ہوا۔ جن کا نام شیخ دانیال تھا۔ اسی مناسبت سے شاہزادے کا نام دانیال رکھا گیا۔

خود شیخ دانیال کی نسبت ملا نظام الدین احمد لکھتے ہیں:

"از مشایخ وقت در صلاح و تقویٰ ممتاز"

(طبقات اکبری)

ابو الفضل، اکبر نامہ میں لکھتے ہیں:

"نور صلاح و فلاح از ناصیۂ او می تافت"

(اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۵۷)

یعنی صلاحیت و نیکی کا نور اُن کی پیشانی میں چمکتا تھا۔

ملا عبد القادر بدایونی اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں:

"شیخ دانیال نام مجاورے صالح"

(منتخب التواریخ)

یعنی شیخ دانیال ایک بزرگ مجاور تھے۔

معتمد خاں اپنی کتاب اقبال نامہ جہانگیری میں لکھتے ہیں:

"بصلاح ظاہری و صفائے باطنی امتیاز داشت"

(اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۲۳)

یعنی ظاہری اور باطنی بزرگی اور خوبی رکھنے کی وجہ سے ایک ممتاز فرد تھے۔

ان ہی شیخ دانیال کے لئے مولانا خواجہ معنی اجمیری نے تذکرۂ شعرائے اجمیر[3] میں جو عبارت تحریر فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے:

"شیخ دانیالؒ خدام خواجہؒ کی جماعت کے ایک مقدس ترین بزرگ سنہ [illegible]ھ میں خاندانِ مجاورین آستانۂ عالیہ کی جماعت میں پیدا ہوئے اور اکبر اعظم کے زمانہ تک زندہ رہ کر سنہ ۹۹۳ھ میں ایک صدی سے کچھ زیادہ عمر پانے کے بعد عالم بقا کو راہی ہوئے۔ ان کے مندرجہ ذیل دو شعر بعض تذکروں میں پائے جاتے ہیں":

جگ جگ جیویں حضرت خواجے — حضرت نبی رسول نوا جے

دانیال چو پرگھٹ کیناں — حضرت خواجہ خضر ہتھ دیناں

جگ جگ جیویں، یعنی ہمیشہ زندہ رہیں۔ نواجے۔ یعنی خواجہ نواجے یعنی نوازے۔ پرگھٹ یعنی روشن اور ظاہر۔ ہتھ یعنی ہاتھ۔ کیناں اور دیناں یعنی کیا اور دیا۔

مطلب یہ ہوا کہ حضرت خواجہ حیات ابدی پائیں اور حضرت نبی رسول (ان کو) نوازیں (کہ انھوں نے) دانیال کو روشن کر دیا اور دانیال کا ہاتھ حضرت خواجہ خضر کے ہاتھ میں دے دیا۔

ان اشعار کو اُردو زبان سے جس قدر علاقہ قریبی حاصل ہے وہ خود ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

---

[1] اس سلسلے میں تنقیدات پروفیسر محمود شیرانی اور مولانا خواجہ معنی اجمیری ملاحظہ فرمائیے۔ (سید فضل المتین)

[2] "جواب نامہ" مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ صفحات ۱۴۲ - ۱۴۳ - ۱۴۴ - (سید فضل المتین)

[3] اس غیر مطبوعہ "تذکرہ" کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دے رہا ہوں اور عنقریب ہی "بزم معنی" کی جانب سے شائع کیا جائے گا۔ (سید فضل المتین)

احراز نقوی

علامہ اقبال اور سر عبدالقادر کے دو غیر مطبوعہ خطوط

۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کا پہلا خط —— علامہ اقبال کا خواجہ بشیر احمد کے نام ہے۔ خواجہ بشیر احمد مولوی احمد دین کے بیٹے تھے۔ یہ وہی مولوی احمد دین ہیں جنھوں نے اقبال کی حیات میں "کلام اقبال" کے نام سے تنقید اور تبصرے کے ذیل میں اقبال پر سب سے پہلی کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ لاہور میں مولوی موصوف کے بیٹے کے پاس محفوظ ہے۔ اس نسخہ میں تنقید سے زیادہ نظم کا حصہ شامل ہے جو مختلف مجلوں کی مدد سے اخذ و جذب کئے گئے ہیں۔ مذکور نسخے کے سلسلے میں ایک بڑی عجیب روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ کتاب ابھی بازار میں نہ آئی تھی کہ علامہ اقبال کے ایک دوست نے انھیں اس کتاب کے سلسلے میں اطلاع کر دی۔ اقبال کو جب یہ علم ہوا تو اس خیال سے خاصے کبیدہ ہوئے کہ اصل تو بانگ درا اقبال کا نظر ثانی کیا ہوا کلام تھا اور وہ اسی کو ترویج دینا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ شاید کلام اقبال میں نظم کا مواد زیادہ ہونے کی وجہ سے بانگ درا کی مادی حیثیت کم ہونے کا احتمال تھا۔ اس معاملے کا علم جب مولوی احمد دین کو ہوا تو اقبال کی دلجوئی کی خاطر کتابوں کا سارا ذخیرہ نذر آتش کر دیا۔ حسن اتفاق سے ایک نسخہ ان کے ایک لڑکے نے کسی طرح نکال لیا۔ اقبال کو مولوی احمد دین نے یہ واقعہ سنایا تو انھیں بے حد صدمہ ہوا اور بعد میں اقبال کے اصرار اور مشورے سے یہ کتاب مبارک علی اینڈ سنز کے مطبع سے اس ترمیم کے ساتھ چھپی کہ اب کی نظم کا حصہ کم اور نثر کا حصہ بڑھا دیا گیا۔ بہرحال اس کے باوجود پہلے ایڈیشن کی اہمیت نہ صرف اس لئے ہی کہ اقبال پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے بلکہ اس لئے اور بھی ہے کہ اس میں اقبال کا تقریباً سارا کلام ابتدائی شکل میں موجود ہے۔ اس کتاب کو سامنے رکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اقبال نے الفاظ، تراکیب، مصرعے اور کہیں کہیں پورے پورے اشعار اور بند قطع و برید کئے ہیں۔ کچھ کلام ایسا بھی ہے جس کو اقبال نے بالکل قلم زد کر دیا ہے اور عیب تنافر اور ذم کے پہلوؤں کی احتیاط بھی ملحوظ رکھی ہے۔ یہ خط اقبال نے مولوی احمد دین کی وفات پر تعزیت کے لئے ان کے بیٹے خواجہ بشیر احمد کو لکھا ہے جو مولوی موصوف کے آخری دم تک اقبال سے خوشگوار تعلقات کی ایک دلیل پیش کرتا ہے۔

دوسرا خط —— سر عبدالقادر کا ہے جو انھوں نے ۱۲ر فروری ۱۹۰۹ء کو صادق علی خاں کو لکھا ہے۔ میرے قیاس کے مطابق صادق علی خاں کشمیری نژاد تھے اور معلمی ان کا پیشہ تھا۔ پہلے دور کا مخزن دیکھئے تو ان کا کلام اور تحریریں بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔ مگر سر عبدالقادر نے مخزن کے تیسرے دور کے پہلے شمارے میں (جو ظہیر الدین کی تحریک پر حفیظ جالندھری کی ادارت میں مارچ ۱۹۲۰ء میں نکلا) جو مضمون مخزن پر لکھا ہے اور اس کے ضمن میں جن قلم کاروں کا ذکر کیا ہے ان میں صادق علی خاں کا نام الگ ہے۔ اردو صحافت کی مجلاتی تاریخ کے جائزے میں یہ خط —— مخزن کے "صلح کل" مسلک اور مشرب پر روشنی ڈالتے وقت ایک ثبوت اور ایک اہم دستاویز کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔

یہ دونوں خطوط ذیل میں من و عن پیش کئے جا رہے ہیں:

ڈاکٹر اقبال کا خط (۱)

Dr. Sir Muhammad Iqbal M.L.C.
Barrister-at-law
Lahore

11/29

عزیزم بشیر، السلام علیکم

افسوس ہے کہ میں مولوی[1] صاحب مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہو گیا جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی حرکت سے قاصر رہا۔ دوسرے روز دانت کے ورم کا بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے خواجہ (فیروز دین)[2] صاحب کے بدست آپ کو اپنی معذوری کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ معلوم نہیں وہ پیغام آپ تک پہنچا یا نہ پہنچا۔ بہرحال مجھے یہ افسوس تا زیست رہے گا کہ مرحوم کے لئے آخری دعا جو کی گئی میں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا۔ خدا تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد تھا مگر انجمن کے جلسے میں دیر ہو گئی۔ انشاء اللہ اب حاضر ہوں گا۔ امید ہے شام کے قریب آپ سب بھائی گھر پر ہوتے ہوں گے۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعائے صبر جمیل کے۔

محمد اقبال

عبدالقادر کا خط (۲)

دہلی
۱۲ر فروری ۱۹۰۹ء

مائی ڈیر صادق علی خاں

السلام علیکم

بہت مدت کے بعد آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ میں جب سے اپنے نئے سفر سے واپس آیا ہوں، ایک حساب سے برابر سفر میں ہوں۔ اس لئے میرا سلسلہ مراسلت بہت بے ترتیب رہا۔ خیر بہتر ہو خیریت۔ اس کی تلافی ہو ہی جائے گی۔ آپ نے بھی ایک عرصہ سے کبھی خط نہیں لکھا۔ چند روز ہوئے میں مضامین مخزن ترتیب دے رہا تھا۔ ان میں حصہ نظم میں آپ کی ایک غزل اقبال کی ایک نئی نظم، جن میں شہیدوں اور ایک نظم "اسلام" کے متعلق تھی۔ غزل اور نظم دونوں کو میں نے شوق سے پڑھا۔ نظم مسدس میں ہے جو تضمین فارسی شعر کی جابجا آپ نے کی ہے اس نے کئی جگہ بہت لطف پایا مگر مجھے یہ افسوس ہوا کہ آپ نے باوجود مخزن کے ابتدائی رنگ اور اصول سے واقف ہونے کے، وہ ایک Non-Sectarian اصول پر چلایا گیا ہے اور حتی الوسع اس پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ یہ نظم مخزن کو کیوں بھیجی۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس نظم کو اپنے خطوط کے ساتھ آپ کے پاس واپس بھیج دوں اور یہ لکھوں کہ آپ[3] ہیں تو کوئی اور نظم زیادہ General قسم کی بھیجئے اور اسے کسی اور رسالے کے لئے رکھئے۔ حال میں لاہور میں ایک رسالہ الاخوت چھپنے لگا ہے شاید آپ کے پاس پہنچا ہو۔ اس کے لئے یہ نظم بہت موزوں ہو گی کیونکہ اس کا مقصد مسلمانوں کی اخوت و وحدت پر زور دینا ہے اور اس میں خالص اسلامی نظمیں بآسانی کھپ سکتی ہیں۔
میں دہلی میں اپنی زمانہ Probation کو جو میں نے اپنے لئے تجویز کیا تھا ختم کر چکا ہوں اور عنقریب لاہور واپس جانے کا عزم رکھتا ہوں۔

زیادہ خیریت

عبدالقادر

---

[1] ایڈوکیٹ مولوی احمد دین۔
[2] بیرسٹر ایٹ لا کشمیری نژاد بٹالہ کے رہنے والے اور انگلستان میں غالباً علامہ اقبال کے ہم جماعت بھی تھے۔
[3] یہ لفظ صحیح پڑھا نہیں جاتا۔

بنسی لال شرما

اردو رسم الخط منظم و مدلّل اور صوتی اصولوں پر مبنی ہے

پچھلے مضمون میں حرکات (Vowels) اور سکنات (Consonant) کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ کیسے بنتی ہیں اور ان میں باہمی کیا امتیاز ہے اس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

ہمارے گلے میں بحث مانس کے دو پٹھے سے تاگے ہیں جو صوتی تاگے کہلاتے ہیں کیونکہ ان ہی سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ عموماً یہ تاگے ڈھیلے رہتے ہیں اور ہماری سانس ان میں سے گزر کر آتی جاتی رہتی ہے اور ان میں کسی قسم کی آواز پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر آواز پیدا کرنا مقصود ہو تو ذراسی نامعلوم کوشش سے ان تاگوں کو تان دیا جاتا ہے اور باہر آنے والی سانس ان کے درمیان میں سے گزرتی ہوئی ان تاگوں کو متحرک کرتی اور کپاتی ہے اور ان میں سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ صوتی تاگے تن کر اُسی طرح آواز پیدا کرتے ہیں جس طرح بلانے پر ستار کی تنی ہوئی (اینٹھی ہوئی) تاریں۔ گلے میں پیدا شدہ یہ آواز اگر منہ کے خلا میں سے بغیر کسی رکاوٹ کے گزر کر باہر آئے تو یہ حرکت کہلاتی ہے جیسے آ، او، اے یا ای۔ پس کھلے منہ کی آواز کو حرکت (vowel) کہتے ہیں۔ لیکن اگر گلے کی آواز منہ کے خلا میں کسی طریقہ سے مثلاً گلے کے منہ میں کھلنے والے راستے کو بھینچ کر بند کرنے سے، یا زبان کو منہ کی چھت (تالو وغیرہ) پر لگا کر یا ہونٹوں کو موندنے سے روک لی جائے تو یہ رکی آواز ہی ساکن (Consonant) کہلاتی ہے جیسے گلے کو بھینچنے سے گ گھ۔ زبان کی رکاوٹ سے ج، جھ، ڈ، ڈھ وغیرہ اور ہونٹ موندنے سے ب، بھ، م سکنات وجود میں آتی ہیں۔ پس یاد رکھو کہ منہ کے خلا میں رکی آوازیں سکنات ہیں اور جب تک اس رکاوٹ کو دور کر کے یعنی منہ کھول کر کھلے منہ کی آواز (حرکت) ان کے ساتھ نہ لائی جائے یہ اپنی آواز دینے سے قاصر ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سکنات گونگے حروف ہیں اور جب تک ان کے ساتھ کوئی حرکت نہ لائی جائے یہ بول نہیں سکتے۔ چنانچہ ابجدی سکنات کو ایسے پڑھا جاتا ہے مانو ان کے ساتھ "زَ" حرکت لگی ہو۔ جیسے بَ۔ سَ۔ کَ۔ مقصد کہ تمام کھلے منہ کی آوازیں حرکات اور بند منہ کی رکی آواز سکنات کہلاتی ہیں۔

ں (نون غنّہ) کی ماہیت (Nature) اور اس کا کردار (Function)

حرکات دو قسم کی ہیں۔ (۱) منہ سے بولی جانے والی۔ جیسے اَ او، اے، ای۔ دوسری منہ اور ناک (دونوں) سے بولی جانے والی جیسے آں، اوں

$$\left\{\begin{array}{l}\text{اے + ں (اصول نمبر ا)}\\ \text{ایں}\\ \text{ایں}\end{array}\right\}$$ اور ایں

دوسری قسم کی حرکات بنانے کے لئے پہلی قسم کی حرکات کے ساتھ ناک کی نشانی "ں" (نون غنّہ) لگائی جاتی ہے۔ جو کہ خود تو بے آواز ہے لیکن یہ ظاہر کرتی ہے کہ پہلی حرکت کو ناک سے پڑھو۔ جیسے آ + ں = آں اُو + ں = اُوں وغیرہ۔

aan n aa

حرکات آ۔ اُو۔ اے کے ساتھ لگنے والا "ں" نون غنّہ اپنی کوئی بھی آواز نہیں رکھتا۔ صرف پہلی حرکت کی آواز میں یہ اصلاح کر دیتا ہے کہ یہ صرف منہ سے پڑھی جانے کی بجائے ناک سے بھی بولی جاتی ہے۔ اس لئے ں نون غنّہ کوئی بھی آواز رکھنے والا آزاد حرف نہیں۔ اگر "ن" کی طرح یہ بھی آزاد حرف ہوتا تو ن کی طرح لفظ کے شروع میں یا کسی حرف ساکن کے بعد بھی لگ سکتا۔ لیکن یہ بات نہیں۔ پس "ں" (نون غنہ) حرف ناک کی نشانی ہے۔ حرف نہیں۔ کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ نون غنہ (ں) انسانی ناک کی شکل نہیں؟ 

ں (نون غنہ) لفظ کے درمیان میں ایک درمیانی شکل "ن" اختیار کرتا ہے اور تحریر میں "ن" ساکن کی طرح ہی اشکال لیتا ہے۔

آں + کھ	ہوں + ٹ	بچ نگل نس ہنس (ایک پرندہ)
= آن + کھ	= ہون + ٹ	آنچ سانگل مانس ہنس (ہنسنا سے فعل امر)
= آنکھ	= ہونٹ	

ہمزہ کی اہمیت سمجھانے کے لئے اس کی مندرجہ ذیل وضاحت زیادہ سود مند ہو گی۔ اردو میں حرکات کا جیون (زندگی) قربانی اور ایثار کا جیون ہے۔ ان کی زندگی کا نصب العین اپنے گونگے آقاؤں (سکنات) کی بے غرض خدمت کرنا ہے یعنی ان کو قوت گویائی بہم پہنچانا ہے۔ یہ سکنات کو اپنا معبود مانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وفادار خادماؤں کی طرح ان کے (سکنات کے) پیچھے پیچھے چلتی ہیں یعنی سکنات کے بعد ہمیشہ دوسری جگہ پر لکھی جاتی ہیں جیسے "دو" میں۔ و حرکت "د" ساکن کے بعد لکھی گئی ہے۔ اور اگر کسی ضرورت کے پیش نظر ابتدائی ساکن چلا بھی جائے تو کبھی اس کی خالی کردہ گدی (پہلی جگہ) پر بیٹھنے کی گستاخی نہیں کرتیں اور اپنی دوسری جگہ پر ہی قائم رہتی ہیں۔

(i) دو = do

(ii) - د = o یہاں - و حرکت خالی شدہ پہلی جگہ پر جا کر نہیں بیٹھتی۔ حتیٰ کہ پہلی جگہ کے خلا کو پُر کرنے کے لئے وہاں لگی Aash ہی سیدھی کھڑی ہو کر ایک بے آواز فرض ساکن (بے آواز ابتدائی الف) بن جاتی ہے جیسے (iii) او = o

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حرکات سکنات کی دست بستہ خادمائیں ہیں۔ لیکن اپنی ہم جنس (حرکات) کی جانی دشمن واقع ہوئی ہیں۔ اس بارے میں یہ کتوں کے مشابہ ہیں جو کہ انسان کے وفادار نوکر ہوتے ہوئے اپنی جنس (دیگر کتوں) کے بیری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر دو حرکات

یکے بعد دیگرے آجائیں تو قدرتی دشمنی کی وجہ سے اُن میں سخت لڑائی ناگزیر ہے جیسے آ ؤ (آ ء و) لفظ میں دو حرکات آ اور ـو اکٹھی ہوگئی ہیں۔ اس لئے آ اپنی لاٹھی ـو پر چلاتا ہے لیکن دونوں کے بیچ میں ء موجود ہونے کی وجہ سے وہ لاٹھی اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچ کر درمیانی الف پر پڑتی ہے۔ اسی طرح ـو کی لاٹھی اپنے حریف آ تک نہ پہنچ کر درمیانی الف پر ہی پڑتی ہے۔ اس طرح دونوں اطراف سے لاٹھیاں کھاتا ہوا بھی درمیانی الف بھاگ نہیں جاتا بلکہ دونوں کے درمیان کھڑا رہ کر دونوں کو امن اور آشتی کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ متواتر لاٹھیاں کھانے سے اس بیچارے کا حلیہ بھی بگڑ جاتا ہے یعنی ا سے ء ہو کر ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس امن اور صلح کے کارندہ پر آفرین ہے کہ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر بھی دونوں کے بیچ ہی ڈٹا رہتا ہے اور آخر میں دونوں حریف تھک ہار کر آرام سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بگڑی ہوئی شکل والا الف (ہمزہ) ان کو علیٰحدہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جیسے آ او۔ لیکن یہ صلح اور آشتی کا دیوتا (ہمزہ) ـ آ ء و

دو حرکات ہمزہ کی ماہیت (nature) اور اُس کا کردار (function) لفظ میں جب ایک حرکت کسی دوسری حرکت کے بعد لگے یعنی دونوں کے درمیان کوئی حرف ساکن حائل نہ ہو تو بعد میں لکھی جانے والی حرکت کا ابتدائی الف ایک ٹیڑھی میڑھی درمیانی شکل لے لیتا ہے جو کہ ہمزہ کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ ہمزہ بے آواز ابتدائی الف کا متبادل ہے اس لئے یہ بھی بے آواز ہے۔ لیکن اس کا کردار بہت اہم ہے کیونکہ یہ دو حرکات کے درمیان ایک نکھیڑنے والے خط 'dash' یا 'hiatus' کا کام دیتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں حرکات کو علیٰحدہ علیٰحدہ یکے بعد دیگرے پڑھو جیسے

آ + او	دا + اِی	رو + اے
= آ ؤ	= دا ئِی	= رو ءے
= آ ؤ	= دا ئی (دائی)	= روئے (روئے)

درمیانی ہمزہ hiatus کا کردار ادا کرتا ہے یعنی دونوں حرکات کو یکے بعد دیگرے علیٰحدہ علیٰحدہ پڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ آؤ پڑھنے میں آ ـ او ایسے پڑھا جائے گا۔

اگر دو حرکات کے درمیان ہمزہ نہ ہو تو دونوں میں سے ایک پڑھی جائے گی اور وہ پڑھی جائے گی جو کہ ابجد میں پہلے لکھی گئی ہے اور ابجد میں بعد میں لکھی گئی حرکت نہیں پڑھی جائے گی جیسے

اُدھئے میں دو حرکات اے اور آ یکے بعد دیگرے آئی ہیں، لیکن ان کے درمیان ہمزہ نہیں اس لئے ابجد میں اے سے پہلے لکھا جانے والا آ پڑھا جائے گا۔ اے نہیں جیسے

اُدھئے = اُدْ + ھْ + ـے + ا

= اُدْ + ھْ + ... + ا = اُدھا

بانگل میں دو حرکات اِ اور آ بنا درمیانی ہمزہ کے آئی ہیں اس لئے ابجد میں آ سے پہلے لکھی جانے والی اِ پڑھی جائے گی۔ آ نہیں جیسے

بانگل = ب + ـ + ا + ِنگُل

= ب + ... + ِنگُل = بِنگُل

کے درمیان نہ ہو تو دونوں حرکات کو آپس میں گتھم گتھا ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور طاقتور حرکت اپنی کمزور حریف (دوسری حرکت) کو مغلوب کرکے ہی چھوڑتی ہے۔ یعنی اسے مار گراتی ہے (چپ کرا دیتی ہے)۔ جیسے

اُدھئے میں دو حرکات اے اور آ بغیر درمیانی ہمزہ کے آئی ہیں اس لئے ان میں باہمی جنگ کے بعد آ حرکت اپنے کمزور حریف اے کو مغلوب کرکے مُردہ بنا دیتی ہے۔ جیسے

اُدھئے = اُدْ + ھْ + ـے + ا

= اُدْ + ھْ + ... + ا = اُدھا

بانگل = ب + ـ + ا + ِنگُل

= ب + ـ + ... + ِنگُل = بِنگُل

بلکہ ہمزہ کے بغیر یکے بعد دیگرے آنے والی تین حرکات میں باہمی جنگ کے بعد صرف ایک حرکت فتح یاب ہوتی ہے، اور دوسری دو کمزور حرکات فوت ہو جاتی ہیں۔ جیسے (نقش) فےاُنجر میں تین حرکات اے۔ اِ۔ اُ یکے بعد دیگرے بغیر درمیانی ہمزہ کے آئی ہیں اس لئے ان میں سے دیگر دونوں سے زیادہ طاقتور اِ ہی غالب آتی ہے اور اُ اور اے دونوں ہی مغلوب ہو کر بے جان (بے آواز) ہو جاتی ہیں جیسے

فےاُنجر = ف + ـے + ـ + اُ + ِنجر

= ف + ... + ـ + ... + ِنجر = فِنجر

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ طاقت کے لحاظ سے ابجد میں پہلے لکھی جانے والی حرکات بعد میں لکھی جانے والی حرکات سے زیادہ طاقتور ہیں۔

یہاں حرکات پر بحث ہو گئی ہے آئندہ مضمون میں سکنات کا باب شروع کیا جائے گا۔

ضروری اطلاع!

اگر آپ کے پتہ پر سرخ نشان ہے تو [illegible] کی سالانہ قیمت ختم ہو چکی ہے [illegible] ہمارے خریداری ختم ہو جائے گی مہربانی فرما کر [illegible] کی سالانہ قیمت جلد سے جلد [illegible] بھیجئے تاکہ سلسلہ جاری رہے۔

مینجر

"قومی جنگ کے ادبی محاذ" کا افتتاح

۲۲ اپریل کو نئی دہلی میں "قومی جنگ کا ادبی محاذ" کا نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے افتتاح فرمایا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "سونا کندن بن کر نہیں چمکتا جب تک آگ میں نہ تپے۔ اسی طرح کسی شخص یا کسی ملک کا اصلی روپ اس وقت تک نہیں نکھرتا جب تک وہ مصیبت کی آنچ نہ سہے۔ شاید ہم میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم اپنے دیس کو جس شکل میں روزمرہ دیکھتے ہیں، مذہب، زبان، ذات پات، علاقے، طبقے کے لحاظ سے جتھوں اور ٹولیوں میں بٹا ہوا۔ آپس کے سیکڑوں ہزاروں جھگڑوں میں الجھا ہوا، وہی اس کی اصلی شکل ہے۔ مگر اس آزمائش نے جس سے ہمیں اپنے پڑوسی ملک چین کے اچانک حملے کی وجہ سے گزرنا پڑا، سکھا دیا کہ ہماری زندگی کا اصلی دھارا جو کثرت اور کش مکش کی ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی سطح کے نیچے بہتا ہے وحدت اور یک جہتی کا دھارا ہے۔ لداخ سے مدراس اور نیفا سے کیرل تک کروڑوں دل ایک دل ہو کر دیس کی حفاظت کے لئے تڑپ اٹھے۔ کروڑوں زبانیں ایک زبان ہو کر حملہ آور دشمن کو للکارنے لگیں۔ کتنی پیاری، کتنی موہنی، کتنی دلکش، کتنی جانفزا تھی دیس کی یہ تصویر جس نے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائی اور ہماری روح کو گرمایا۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ دیس کی آن پر جان چھڑکنے والے دیش بھگتوں میں یوں تو ہر طبقے ہر درجے اور ہر پیشے کے لوگ شامل ہیں۔ لیکن ان میں سب سے نمایاں وہ لوگ ہیں جو دوسروں سے سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل رکھتے ہیں اور اپنے فکر و احساس کو دوسروں تک منتقل کر سکتے ہیں۔ یعنی ہمارے ادیب شاعر اور صحافی ہماری پندرہ سولہ بڑی بڑی زبانوں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانوں کے لکھنے والوں نے اپنے دن رات اس کے لئے وقف کر دئے ہیں کہ اپنے ہم زبانوں کو اپنے مضمونوں کے ذریعے اس خطرے سے آگاہ کریں جو دیس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس کے سب پہلو سمجھائیں۔ اس کی ساری باریکیاں بتائیں۔ اس سے بچنے کے گر سکھائیں۔ اس کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں سمجھائیں۔ اپنے شعروں گیتوں اور افسانوں میں ان محبان وطن کے گن گائیں جو اپنا جان و مال، چین، آرام دیس پر نچھاور کر رہے ہیں اور دوسروں کو اس پر ابھاریں اور اس کی ہمت دلائیں کہ وہ ان دیش بھگتوں کے نقش قدم پر چلیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اردو کے اہل قلم بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ جس ادیب کو دیکھئے اپنے وطن کی عزت و عظمت کا نقیب اور جس شاعر کو سنیئے وہ اپنی قوم کی جی داری اور جگر داری کا رجز خواں بن گیا ہے۔

آخر میں "محاذ" کے کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ رسم عام کے خلاف اپنے "محاذ" کے افتتاح کی رسم کام شروع کرنے سے پہلے نہیں بلکہ اس کو چلانے اور جمانے کے بعد ادا کی۔ میں بڑی خوشی سے اس "ادبی محاذ" کا افتتاح کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اسے اپنے مبارک مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔

مراسلات

پنجاب میں اُردو

پارلیمنٹ میں لسانی بل پر تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا۔ کہ

"—— بھاشا کے معاملے میں ہمیں ذرا احتیاط سے کام لینا چاہئے اس میں ہم جتنا بھی فراخ دل ہو سکتے ہیں ہونا چاہئے کسی بھی زبان کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اور جہاں تک ممکن ہو کسی شخص کو کسی خاص زبان کے استعمال پر مجبور نہیں کرنا چاہئے۔ جب کبھی کسی زبان کو دبانے کی کوشش کی گئی یا لوگوں کو کسی خاص زبان اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ نتیجہ ہمیشہ ہی خراب نکلا ——"

وزیر اعظم کے الفاظ بہت واضح اور ان کے خیالات اپنے اندر حقیقت کا پہلو رکھتے ہیں، امید نہیں کہ کسی معقولیت پسند کو موصوف کے خیالات سے اختلاف ہو مگر اس کے باوجود صوبائی حکومتیں اُردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھے ہوئے ہیں اس کے خلاف مرکزی سرکار کوئی موثر قدم اٹھانے کو تیار نہیں اگر وزیر اعظم کا یہ ارشاد 'اصول' کا درجہ رکھتا ہے تو یہ اصول ہندی ہی نہیں تمام زبانوں پر مساوی نافذ ہونا چاہئے، اگر انگریزی کی جگہ ہندی کو واحد قومی زبان قرار دینے کا فیصلہ ہندی نہ بولنے والے لوگوں کی مرضی پر منحصر ہوگا تو باقی زبانوں پر یہ اصول لاگو کیوں نہیں کیا جاتا۔

پنجاب میں 'احتیاط' اور "فراخ دلی" کو بالائے طاق رکھ کر اُردو کو بالکل نظر انداز کرکے حکومت نے ڈنڈے کے زور سے ہندی اور پنجابی رائج کر دی اور اس وقت تک کے لئے بھی اُردو کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی کہ مذکورہ دونوں زبان کام چلانے کے قابل ہو سکیں۔ آج بھی جو میونسپل کمیٹیاں اُردو میں کام چلانے پر مصر ہیں انھیں حکومت دھمکیاں دے رہی ہے کہ وہ فوراً تمام کام ہندی یا پنجابی میں چلانے کا انتظام کریں ورنہ سخت قدم اُٹھایا جائے گا۔

ہندی اور پنجابی کے مقابلے میں دونوں ریجنوں میں اُردو سے نہ صرف بہتر طور پر کام چل رہا تھا بلکہ آج بھی چل سکتا ہے۔

(سورج تنویر)

حیدر آباد میں اُردو ادبی سمینار

حیدر آباد کی مختلف ادبی، تہذیبی اور سماجی تنظیموں کے علاوہ ممتاز ادبی شخصیتوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں ایک اردو ادبی سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کا اہتمام کرنے کے لئے شہر کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور صحیفہ نگاروں پر مشتمل ایک تیاری کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ اس کمیٹی نے ۱۸ اور ۱۹ مئی ۶۳ء کو سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے حسب ذیل موضوعات بحث منتخب کئے ہیں:

(۱) ادب کے عصری تقاضے۔ (۲) آندھرا پردیش میں اُردو کا موقف اور مسائل۔ (۳) آندھرا پردیش میں اُردو ادب (ایک جائزہ)

(سکریٹری ادبی سمینار)

بقیہ: ادب میں علاقائیت

اور اس اصول پر خاطر خواہ عمل بھی اُردو زبان کی تعمیر اور ارتقا کی تاریخ کا سرعنوان ہے۔ اس اعتبار سے تو اُردو خاتم الالسنہ ہے۔ اس کے حروف تہجی کا موازنہ اگر دنیا کی تمام بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی زبانوں سے کیا جائے تو انکشاف ہوگا کہ اُردو دنیا کی واحد زبان ہے جس میں ایک جاندار کے مُنہ سے نکلنے والی تمام آوازوں کے لئے مُستقل حروف ہیں۔ لسانی اعتبار سے اُردو کی یہ کاملیت صرف اس لئے ہے کہ ملکی و علاقائی زبانوں سنسکرت اور بھاشا کے علاوہ غیر ملکی زبانوں عربی، فارسی، پرتگالی، ترکی اور انگریزی وغیرہ کسی سے موزوں اثر قبول کرنے میں اُردو نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہ مانع کسی کی نہ ہوئی، جامع سب کی ہی۔ اُردو کے سانچے میں یہ لچک آج تک موجود ہے۔ اس کا ارتقائی عمل بھی ہنوز جاری ہے۔ اب اس کو تاثیر و تاثر کا سابقہ ہندوستان میں ہندی، بنگالی، تلگو اور مراٹھی وغیرہ اور پاکستان میں پنجابی، بنگالی، سندھی اور پشتو وغیرہ سے درپیش ہے۔ پچھلے تجربات پر اعتماد کرکے پوری توقع ہے کہ اُردو اس نئی آزمائش میں بھی کامیاب ثابت ہوگی۔ ناکامی کا جو کچھ اندیشہ ہوتا ہے وہ اس اضطراب سے جس نے اُردو کے چند دوستوں کو ایک معمولی بات کو غیر معمولی مسئلہ بنا دینے پر مائل کر دیا ہے۔ خدشہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کی تشویش اب تک کے توازن کو برہم نہ کر دے۔ (جب کہ پس منظر میں اُردو کے قاتل دشمن رسم خط تک بدل دینے کی سازش کر رہے ہیں)۔

بہرحال، علاقائیت کے علم برداروں کی طرف سے ایک سنگین سوال زمانے کے تغیرات کا اٹھایا جاتا ہے یعنی اگر اُردو کو شعوری طور پر ترقی دینے کی کوشش نہیں کی گئی تو زمانے کی رفتار خود بخود اس میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دے گی کہ چند برسوں کے بعد صورت بگڑ کر پہچانی نہیں جائے گی۔ یا پھر یوں کہیے کہ آج کی اُردو اور کل کی اُردو میں کوئی مشابہت نہیں رہ جائے گی۔ زمانہ اُردو کی موجودہ صورت کو عجائب گھر میں ڈال کر آگے بڑھ جائے گا اور اس کے بچے کھچے آثار سے ایک بالکل نئی زبان تخلیق کر دے گا، ماضی کی صدیوں پر پھیلی روایت کے ساتھ مستقبل کا کوئی زندہ ربط نہیں رہ جائے گا، قدیم اور جدید کے درمیان کامل تفریق اور مکمل اجنبیت پیدا ہو جائے گی۔ آج کی اُردو کل والوں کے لئے ویسی ہی ناقابل فہم ہو جائے گی جیسے مثال کے طور پر قدمائے دکن کے نمونے ہمارے لئے ہیں۔ اس خرابی سے بچنے کا واحد طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اُردو مختلف لسانی علاقوں میں وہاں کی بولیوں سے بیش از بیش ہم آہنگ ہو جائے۔ خاص کر پاکستان میں یہ تحریک اٹھائی گئی ہے کہ اُردو ایک طرف پنجابی و سندھی اور دوسری جانب بنگالی سے گھری ہوئی ہے۔ مغربی حصّے کی زندہ عوامی بولیاں پنجابی اور سندھی ہیں اور مشرقی حصّے میں بنگلہ کا راج ہے، لہٰذا اگر اُردو کو جینا ہے تو ان علاقائی بولیوں کے لسانی و ثقافتی اشاروں کو جذب کرنا ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ خود اُردو ہی میں مقامی بول چال کے اطوار کو ادب میں اپنانا ہی ہوگا، خواہ یہ اطوار زبان کے مسلّم قاعدوں اور مرّوج محاورے کے کتنے ہی خلاف ہوں، اس لئے کہ یہ اطوار علاقائی مزاج کا اشاریہ ہیں۔

علاقائیت کے لئے اس ساری دلیل بازی میں سب سے بنیادی نکتے کو فراموش کر دیا جاتا ہے، یا شاید اس سے واقفیت ہی نہیں۔ وہ یہ کہ اُردو زبان اب تغیر کے عبوری دور میں نہیں۔ قریب ایک صدی بیت گئی اس کو ایک باضابطہ زبان اور ادب بنے۔ اس کا ایک سانچہ مقرر ہو چکا ہے۔ اس کے قواعد منضبط ہو چکے ہیں۔ اس کی عبارت متعین ہو چکی ہے۔ اس کا ایک خاص الخاص لسانی مزاج اور ادبی کردار متشکل ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب زبان اور اس کے ادب میں دوسری زبانوں سے لئے ہوئے عناصر کو روشناس کرانا آسان کام نہیں۔ اب اس کام میں بڑی نزاکتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب ایسی جو کوشش بھی ہوگی اندرونی جذبے سے ہوگی نہ کہ بیرونی تحریک سے۔ اجنبی نقوش کو خارج سے عاید نہیں کیا جا سکتا باطن ہی میں نافذ کرنا ہوگا۔ اُردو ادب کی ایک روایت قائم ہو گئی ہے کوئی اضافہ اس روایت سے بغاوت کرکے ممکن نہیں۔ زبان جیسے جیسے وسیع ہوتی جائے گی اس کو ہر قدم پر نئے نئے عناصر سے سابقہ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ سب کو قبول نہیں کر سکتی اگر اس کی اپنی کوئی ہستی ہے۔ اور جس کو وہ قبول بھی کر لے گی تو اپنے معیار پر گھس کر اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرکے۔

یہ ہے ایک تاریخی حقیقت موجودہ اُردو زبان و ادب کے بارے میں۔ اسی کی بدولت اس حادثے کا کوئی اندیشہ نہیں کہ آج سے پچاس، سو یا پانچ سو برس بعد اُردو کی ہیئت بدل جائے گی اور آج کی اُردو کو لوگ قلی قطب شاہ کی تخلیقات کے مانند تشریحات کے ذریعہ سمجھ پائیں گے۔ قلی قطب شاہ کے زمانے میں اُردو کا ہیولا بن رہا تھا۔ آج اُردو کی ہیئت معین اور مستحکم ہو چکی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب حالی سے حفیظ تک نصف صدی کے طویل عرصے میں اُردو شاعری کی زبان بالکل یکساں رہی تو چند اور صدیوں کے بعد یہ اس درجہ دگرگوں کیسے ہو جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہوگا؟ اس سلسلے میں دنیا کے دوسرے ادبوں، مثلاً انگریزی، کا مطالعہ کریں تو مسئلہ قطعی واضح ہو جاتا ہے۔ سویفٹ اور شا کے درمیان دو سو سال سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ لیکن انگریزی نثر کا ڈھانچہ بیسویں صدی میں بھی وہی رہا جو اٹھارویں صدی میں تھا۔

میں تو کہوں گا کہ اب اُردو وسعت کے اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ اس کے انضباط کے لئے فرانسیسی اکیڈمی جیسے ایک نگراں ادارے کی ضرورت ہے جو اس کو زیادہ سے زیادہ حدود کا پابند کرے، نہ کہ بے مہار چھوڑ دے۔ اگر ایسی کوئی تنظیم بروئے کار نہیں لائی جا سکی تو سخت افراتفری کا خدشہ ہے۔ اس وقت ضرورت ارتکاز کی ہے، انتشار تو پہلے ہی پیدا ہو رہا ہے!

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

تاریخ گجرات

مؤلفہ پروفیسر مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم
قیمت مجلد آٹھ روپے ۔ غیر مجلد سات روپے ۔
ناشر ۔ ندوۃ المصنفین ۔ اردو بازار جامع مسجد ۔ دہلی

تاریخ کا مذاق ہند میں مسلمانوں کے ساتھ آیا ۔ مگر مرکز یا اس کے گرد و پیش کے علاقوں کو چھوڑ کر دور افتادہ خطہ ہائے ہندوستان کی تاریخ زیادہ تر گمنامی میں رہی ہے ۔ خاندیس، گجرات، سندھ، بنگال کا قدیم دور تو در کنار ۔ اسلامی دور بھی زیادہ اُجاگر نہیں ہے مواد کی کمی یا اس کے منتشر ہونے کی وجہ سے خصوصی طلبۂ تاریخ کے سوا دوسرے تعلیم یافتہ اصحاب ان علاقوں کی علمی، تمدنی اور صنعتی ترقیات سے واقف نہیں ۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ہندوستان کے ایک ممتاز علمی گھرانے کے ایک لائق فرد نے اس طرف توجہ کی ۔ یعنی مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے مولانا سید سلیمان ندوی کے برادر زادے اور علامہ شبلی کے شاگرد اور اسی کے ساتھ تاریخ گجرات کے ماہر خصوصی تھے گجرات کی تاریخ مرتب کی جس کا سلسلہ صدیوں تک پھیلا ہوا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں کرشن جی سے شروع ہو کر آخری تغلق بادشاہ پر ختم ہوتا ہے ۔ مقدمے میں گجرات پر جغرافیائی، صنعتی، تجارتی، لسانی معلومات فراہم کی گئی ہیں، اور ان کے لئے تمام عربی، فارسی اور انگریزی ماخذ چھانے گئے ہیں ۔ اس کے بعد سیاسی تاریخ شروع ہوتی ہے ۔ باب اول میں ہندوؤں کا راج ۔ باب دوم میں عرب و ہند کے قدیم تعلقات اور مسلمانوں کی آمد ۔ باب سوم میں غزنوی اور غوری فاتحین کا ذکر اور باب چہارم میں گجرات کا سلطنت دہلی کے تحت ہونا بیان کیا گیا ہے، اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ اردو زبان میں تاریخ گجرات پر یہ واحد کتاب ہے جو اپنی جامعیت، متانت تحریر اور قوت استدلال کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہے ۔

سلطان جمہور

از مولانا مسلم ویلوری
قیمت ۔ ۹۰ نئے پیسے
ملنے کا پتہ ۔ ٹیپو خالد خان، ٹیپو منزل، خانخاں ہلی روڈ، جے نگر ۔ بنگلور ۱۱ ۔

اگر کوئی دریافت کرے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے پُر آشوب زمانے میں ہندوستان کے سیاسی افق پر غداری، وطن دوستی، عدل و انصاف، عفو و کرم، بہادری اور بے تعصبی کا کونسا ستارہ طلوع ہوا تھا جو اپنی روشنی دکھا کر جلد ہی غروب ہو گیا تو اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہوگا ۔ سلطان شہید ٹیپو ؒ ۔ اسی لئے گاندھی جی نے سلطان مرحوم کے اس مقولے کو بجا طور پر الہامی کہا ہے (گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی) اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال ٹیپو کی سلطنت خداداد کو خلافت راشدہ کا نمونہ کہتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے نہایت کامیابی کے ساتھ سلطان کے اخلاق، انتظامی اصلاحات، جنگوں اور شہادت کی تفصیلات بیان کی ہیں، اور دکھایا ہے کہ اگر وقت پر انگریز کی چال نہ چل جاتی اور مرہٹے اور نظام سازش میں شریک نہ ہوتے تو ہندوستان کا نقشہ ہی دوسرا اور کہیں بہتر ہوتا ۔ کتاب نہایت پُر از معلومات دلچسپ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور ہر وطن دوست کے ہاتھوں میں جانے کے قابل ۔

ینابیع التصوف

از جناب طالب صفوی، رئیس شمس آباد، ضلع فرخ آباد ۔
قیمت ۔ عہ
منی آرڈر کے ذریعے سے مصنف سے دستیاب ہو سکتی ہے ۔

تصوف کا مسئلہ اہل علم میں ایک معرکۃ الآرا بن کر رہ گیا ہے ۔ مستشرقین اور علمائے اسلام اور خود صوفیہ، ہر ایک کا نقطۂ نظر دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہے ۔ بعض لوگ تصوف کے ہر جز و کو آیت و حدیث سمجھتے، اور دوسرے اس کو سرے سے شجر ممنوع ٹھہراتے ہیں ۔ فاضل مصنف نے تصوف کے ینابیع (Sources) ہی کو موضوع بحث قرار دیا ہے، اور ہر پہلو پر سیر حاصل نظر ڈالی ہے ۔ مصنف (نواب سید محمد عباس طالب صفوی) ایک وسیع النظر صاحب علم ہیں ۔ موصوف نے زیر نظر موضوع پر عربی اور انگریزی کی تمام مشہور تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اور نتائج اخذ کئے ہیں ۔ ان سطور کی گنجائش اسکی مقتضی نہیں کہ یہ دکھایا جائے کہ ہمارے نزدیک تصوف میں کون عناصر اسلامی ہیں اور کون غیر اسلامی ۔ اور آخر الذکر عناصر کا سرچشمہ کہاں ہے ۔ کوئی شخص مصنف کی کسی رائے سے اختلاف تو کر سکتا ہے، مگر ان کی وسعت نظر اور تبحر علمی سے انکار نہیں کر سکتا ۔ ضرورت ہے کہ ہر شخص جو تصوف جیسے موضوع سے دلچسپی رکھتا ہو (خواہ اس کا نقطۂ نظر کچھ بھی ہو) کتاب مذکور کا مطالعہ کرے ۔ ہمارے علم میں اردو میں اس بحث پر کوئی ایسی فکر انگیز کتاب نہیں لکھی گئی ۔ شروع میں "سخن ہائے گفتنی" کے بعد "حدیث دیگراں" کے عنوان سے تصوف کے بارے میں مستشرقین کی رائیں پیش کی گئی ہیں، اور بعد کو "سر دلبراں" کے تحت ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ۔

مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا